



دوقومی نظریہ

محمد عابدی

حضرت مجدد الف ثانی
اور
علامہ اقبال کی نظریں

مرتب
محمد عبدالحکیم شرف قادری

رضا اکیڈمی راجشہی رجسٹرڈ لائبریری
(پاکستان)

دوقومی نظریہ

حضرت مجدد الف ثانی اور علامہ اقبال
کی نظروں میں

ترتیب

محمد عبدالحکیم شریف قادری

رضا الہی کی دینی، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام ربانی اور دو قومی نظریہ

محمد عبد الحکیم شرف قادری

نام کتاب ————— دو قومی نظریہ، حضرت مجدد الف ثانی

اور علامہ اقبال کی نظریں

ترتیب ————— محمد عبد الحکیم شرف قادری

تاریخ اشاعت ————— ربیع الاول ۱۴۱۸ھ اگست ۱۹۹۷ء

صفحات ————— ۳۲

ناشر ————— رضا اکیڈمی

مطبع ————— احمد سجاد آرٹ پریس، مہینہ روڈ لاہور

————— دہرائے غیر ملکی، مادیہ (رضا اکیڈمی) رحیم پور لاہوری

مطایع بھیجنے کے لیے رضا اکیڈمی

اکاؤنٹ نمبر ۹۳۸/۳۸، حبیب بینک - دسین پورہ، رانج ۵ لاہور

برید ڈاک طلب کرنے والے حضرات ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں۔

پیشہ کا پستہ

رضا اکیڈمی رجسٹرڈ مسجد رضا محبوب روڈ، پابراں، لاہور پاکستان

کوڈ نمبر ۵۳۹۰، فون نمبر ۷۶۵۰۳۳

• نحمدہ ونصلی و سلم علی رسولہ الکریم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

جناب صدر گرامی قدر! حضرت حاجی پیر صاحب مدظلہ العالی اور سامعین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میرے مقالے کا موضوع ہے:

”امام ربانی اور دو قومی نظریہ“

میرے لئے یہ امر باعث سعادت ہے کہ مجھے اس عنوان پر گفتگو کی اجازت دی

گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

ان اللہ عز و جل بیعت لہذہ الامۃ علی واس کل مانہ سنہ من یجدلہا

لہنہا (مشکوۃ شریف ص ۳۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے آخر میں ایسی ہستی بھیجے گا

جو اس کے دین کو نکھار کر پیش کرے گی۔

گردش زمانہ کے ساتھ افکار و نظریات میں تبدیلی آ جاتی ہے، عقائد، اعمال اور

احوال کے مسائل دھندلا جاتے ہیں جب کہ دین اسلام لافانی دین ہے، اس کی

حفاظت رب العالمین جل شانہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور حضور سید عالم خاتم

الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیہم و سلم پر سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ آپ کے

بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دین کی حفاظت کا

یہ انتظام فرمایا کہ ہر صدی میں ایسے جلیل القدر اصحاب ایمان پیدا فرمائے جو نبی تو

نہیں تھے لیکن دارِ ثمان انبیاء تھے، انہوں نے حق اور ناحق کو جدا کیا، سنت و بدعت میں فرق کیا، ایمان کی محبت و عظمت دلوں میں بٹھائی، کفر سے نفرت کا درس دیا، فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے افراد کو تقویٰ و طہارت کا پیکر بنا دیا، جہالت اور غفلت کی بدہوشی میں غرق شدہ لوگوں کو خود شناس، خدا پرست اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنتوں کا عامل بنا دیا۔ مختصر یہ کہ انسان نما حیوانوں کو مقامِ انسانیت پر فائز کر دیا۔

امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سہندی قدس سرہ العزیز بھی سلسلہ مجددین کی سنہری کڑی ہیں اور آپ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دنیا سے رحلت فرما جانے کے ایک ہزار سال بعد آپ نے تجدیدِ دین کا کارنامہ انجام دیا اور اس طویل عرصے میں اپنوں کی بے اعتنائی اور بیگانوں کی چیرہ دستی نے گرد و غبار اور غلوک و شبہات کی جو دہیز دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں انہیں مسمار کر کے دینِ متین کا رخ زیباسب کے سامنے بے حجاب کر دیا۔

امام ربانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلسلہ نسب ۲۹ واسطوں سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ۱۷۹ھ میں آپ کی ولادت باسعادت سرہند شریف میں ہوئی، آپ کے والد گرامی شیخ عبدالاحد رحمہ اللہ تعالیٰ کو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین سے سلسلہ قادریہ چشتیہ میں اجازت و خلافت حاصل تھی۔

امام ربانی نے اکثر و بیشتر علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کئے، ان کے علاوہ مولانا کمال الدین کشمیری، مولانا یعقوب کشمیری اور قاضی ہسلول بدخشی سے بھی علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کئے۔ قلعہ گوالیار کی اسیری کے دور (۲۹ - ۱۰۲۸ھ) میں قرآنِ الٰہی حفظ کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی کو سلسلہ چشتیہ میں اپنے والد ماجد سے اور سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ کمال کیتھلی سے اجازت و خلافت تھی۔ ۱۰۰۸ھ میں حضرت امام باقی بلخ سے بیعت ہو کر سلسلہ نقشبندیہ میں اجازت و خلافت حاصل کی (۱) اور آسمان ولایت کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے، آپ نے اتباعِ شریعت و سنت کی ایسی تحریک چلائی جس کے اثرات صرف ہندوستان کے گوشے گوشے میں نہیں بلکہ وسط ایشیاء، شام اور دیگر ممالک تک پہنچے۔

امام ربانی کی مساعی جلیلہ کی بدولت دنیائے اسلام میں نئی بہار آگئی، اتباعِ شریعت کا چلن عام ہوا، ان کی توجہاتِ عالیہ سے صرف ظاہری تبدیلی نہیں آئی بلکہ دلوں کی دنیا میں انقلاب آگیا، کافر جلقہ بگوش اسلام ہوئے، فاسق و فاجر عابدِ شب زندہ دار بن گئے اور خوش بخت حضرات ولایتِ علیا کے مقام پر فائز ہو گئے، دینی مدارس سے قال اللہ، قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں، مسجدیں اور خانقاہیں عبادت و ریاضت اور ذکر و فکر سے آباد ہو گئیں۔ لطیفہ قلب، روح، سر، خفی، اخفی، نفسی اور قلبی ذکر الہی سے معمور ہو گئے، نفی و اثبات اور مراقبات کا دور دورہ ہوا، اخلاص و احسان کے مظاہرے عام ہو گئے، یہ سب اس قدسی صفات ہستی کا فیض نظر تھا جسے دنیا امام ربانی، مجدد الف ثانی کے القاب سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

دو قومی نظریہ

اس نظریے کے فروغ کے لئے امام ربانی قدس سرہ کی مساعی جلیلہ کے بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ آپ کی مجاہدانہ کارروائی کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے۔ آپ کی مصالحانہ کوششوں کا آغاز اکبر کے دور میں ہوا اور جمائیکر کے دور میں ان کوششوں کے ثمرات لوگوں نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لئے۔

اکبر بادشاہ زندگی کے ابتدائی دور میں مخلص مسلمان دکھائی دیتا تھا، باقاعدہ نماز و نفل ادا کرتا، علماء دین کا احترام کرتا یہاں تک کہ بعض علماء کی جوتیاں خود سیدھی کرتا، رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں آنے لگیں اور وہ دین سے دور ہوتا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود علم سے بے بہرہ تھا، اس کے حرم شاہی میں ہندو خواتین شامل تھیں، اس کے دربار میں ہندوؤں کی قدر و منزلت تھی، عیسائی پادریوں سے میل ملاپ تھا اور اس کے ارد گرد ایسے علماء سوء جمع ہو گئے تھے جن کا مسلح نظر بادشاہ کی خوشنودی اور مال دنیا حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا، وہ بھرے دربار میں اس طرح ایک دوسرے سے دست بکریں ہوتے کہ بادشاہ علماء سے تو کیا اسلام ہی سے بد دل ہوتا گیا، ان تمام عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ایک نئے دین ”دین الہی“ کی داغ بیل ڈال دی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ اس دور کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ”تیسرے دور میں دین الہی کا آغاز ہوا اور وہ کچھ ہوا جو ناگفتنی ہے، ہر وہ کام کیا جانے لگا جو اسلام کے سراسر منافی ہے، مثلاً ”کلمہ طیبہ میں ”محمد رسول اللہ“ کی جگہ ”اکبر علیہ السلام“ پڑھا جانے لگا، کابائے کی قربانی پر پابندی لگا دی گئی، خنزیر اور کتوں کا احترام ہونے لگا، شراب اور جوا عام ہو گیا، اکبر نے علماء کو باخبر شراب پلائی، عورتوں کی بے حجابی عام ہو گئی، پردہ پر پابندی لگا دی گئی، زمین بوس کے نام سے سجدہ کا آغاز کیا گیا، عالم و عامی سب بادشاہ کے آگے سجدہ ریز ہونے لگے، بعض مساجد ڈھا دی گئیں اور مدارس عربیہ مسمار کر دیئے گئے، داڑھیاں منڈوا دی گئیں اور شعائر اسلام کا ہر سرعام مذاق اڑایا جانے لگا“ (۲)۔

اندازہ فرمائیں ایسے پر آشوب دور میں کلمہ حق کہنا اور پرچم اسلام بلند کرنا کتنا مشکل ہو گا؟ جب علم سے بے بہرہ اور خود سر حکمران، مخالف اسلام فتنے کا خود بانی ہو، ابو الفضل اور فیضی جیسے علماء اس کے خوشامدی ہوں، مشائخ منقار زیر پر ہوں،

ایسے عالم میں شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی تصانیف کے ذریعے اور امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ اپنے مکتوبات کے ذریعے عوام، علماء، صوفیا اور بادشاہ وقت کے مقربین کو اسلام کی حفاظت اور سرپابندی کے لئے کام کرنے کی دعوت دیتے ہوئے میدان عمل میں سرکھٹ دکھائی دیتے ہیں۔

آج ذرائع ابلاغ اتنے تیز ہیں کہ آنا، فنا، ایک پیغام مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے، امام ربانی کے دور میں اخبارات، ٹیلیویژن اور سیٹلائٹ کا وجود نہیں تھا، اس کے باوجود آپ نے مکتوبات کے ذریعے اسلام کا پیغام مریدین، خلفاء اور ارکین سلطنت تک پہنچایا۔ آپ کے مکتوبات ذاتی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ ہر مکتوب میں دین کا پیغام اور شریعت و طہریقت کا کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا تھا، جس کے نام مکتوب ارسال کیا جاتا وہ اسے اپنی ذات تک محدود نہ رکھتا بلکہ اصل یا اس کی نقل دوسروں تک پہنچا دیتا اس طرح وہ مکتوب تیزی کے ساتھ دور دراز تک پہنچ جاتا۔ ایک ولی کامل و مکمل کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پڑھنے سننے والوں کے دل و دماغ میں اتر جاتا اور انقلاب برپا کر دیتا۔

حضرت امام ربانی نے دین کی جن بنیادی تعلیمات پر بطور خاص زور دیا ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام اور کفر ایک دوسرے کی ضدیں ہیں۔ ان کا آپس میں نہ تو اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی مفاہمت ہو سکتی ہے، اسلام لانے کا صرف یہ مطلب نہیں کہ زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لیا جائے اور دل سے تصدیق کر لی جائے، مسلمان بننے کے لئے تصدیق اور اقرار کے بعد احکام اسلام پر عمل کرنا اور اپنی طاقت کے مطابق اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے کوشش کرنا بھی ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی کفر، معصیت اور کافر سے نفرت و بیزاری اور کفر کے مٹانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا بھی ضروری ہے، ایک مسلمان کے لئے کفر اور کافر کی محبت و تنظیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

ولكن الله حبيب اليكم الايمان وزينه في قلوبكم وكره اليكم الكفر والفسوق والعصيان (۷۹/۷) لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمہارے لئے کفر، فسق اور معصیت کو مکروہ بنا دیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

يا ايها الذين امنوا لا تتخفوا اليهود والنصارى اولياء بعضهم اولياء بعض ومن يتولهم فانه منهم (۵۱/۵)

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ ان میں سے ہوگا۔

اللہ اکبر! کتنا پر جلال ارشاد ہے جسے من کر ایک مسلمان پر کچھ طاری ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص میں تین خصالتیں پائی جائیں ان کے ذریعے وہ ایمان کی حلاوت (مٹھاس) پالے گا۔

۱۔ جس شخص کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں۔

۲۔ جو کسی بندے سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے محبت رکھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر سے نجات دی ہے تو وہ کفر کی طرف لوٹ جانے کو اس طرح مکروہ جانے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو مکروہ جانتا ہے۔ (۳)

نام ربانی نے اپنے مکتوبات میں بڑے درد و سوز کے ساتھ اسلام کی سرملندی اور کفر کے ذلیل کرنے کی اپیل کی ہے، خان اعظم کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

”اسلام کی غرمت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کفار بر ملا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں، کفر کے احکام بے تحاشا جاری کرتے ہیں اور کلی گپوں میں اہل کفر کی تعریفیں کرتے ہیں، مسلمانوں کو اجرائے احکام سے روکا جاتا

ہے اور احکام اسلام بجالانے پر اعتراض کیا جاتا ہے۔۔۔ آپ کو شش فرمائیں کہ کم از کم کافروں کے بڑے بڑے احکام جو مسلمانوں میں عام ہو رہے ہیں وہ ختم ہو جائیں اور مسلمان ان مخالف شریعت کاموں سے محفوظ ہو جائیں۔۔۔ گزشتہ حکومت (اکبر کے دور) میں دین مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دشمنی مترشح ہوتی تھی، اس حکومت میں ظاہراً وہ عناد نہیں ہے اور اگر ہے تو بے علمی کی بنا پر ہے، خوف اس بات کا ہے کہ کہیں اس جگہ بھی معاملہ دشمنی تک نہ پہنچ جائے اور مسلمانوں کے لئے معاملہ (زندگی گزارنا) مشکل ہو جائے“ (۴)۔

ایک دوسرے مکتوب میں جناب سید شیخ فرید کو تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں کافروں کو اپنا اور اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن فرمایا ہے، لہذا خدا اور رسول کے ان دشمنوں کے ساتھ دوستی اور میل جول بڑا گناہ ہوگا، ان دشمنوں کی ہم نشینی اور ان سے میل ملاپ کا کم سے کم نقصان یہ ہے کہ احکام شریعت کے جاری کرنے اور کفر کے نشانات کے مٹانے کی قوت کمزور پڑ جائے گی اور دوستی کا تعلق اس میں رکاوٹ بنے گا اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی دوستی اور محبت، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ ایک شخص یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس قسم کے قبیح اعمال، اس کی دولت ایمان کا صفایا کر دیں گے، ان ناکارہ لوگوں کا کام اسلام اور مسلمانوں کا تسمیر اڑانا ہے، وہ اس بات کے غفلت رہتے ہیں کہ اگر ان کا بس چلے تو مسلمانوں کو تباہ کر دیں یا سب کو قتل کر دیں یا انہیں کافر بنا لیں۔ پس اہل اسلام کو بھی شرم کرنی چاہئے کہ ”العیاء من الایمان“ (حیاء ایمان کے اعمال میں سے ہے) مسلمان ہونے کی

لاج رکھنی چاہئے اور ہمیشہ ان کو ذلیل کرتے رہنا چاہئے" (۵)۔

اس موضوع پر امام ربانی کا جو مکتوب بھی پڑھیں اس کے ایک ایک جملے سے جلال فاروقی جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بندۂ مومن کو سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہونی چاہئے تب ہی اسے ایمان کی چاشنی میسر آسکے گی (جیسے کہ اس سے پہلے حدیث شریف کے حوالے سے بیان ہوا) اب آپ خود ہی سوچئے کہ جس ہستی کے ساتھ ایمان کی حد تک محبت ہو، کیا اس کے دشمن سے محبت ہو سکتی ہے؟ اس کی تعظیم کی جاسکتی ہے، اس کی عزت افزائی کی جاسکتی؟ حاشا دکلا! اگر ایسا کیا گیا تو یہ محبت کی توہین ہوگی اور غیرت ایمانی کے سراسر منافی۔

یہ ہے دو قوی نظریہ جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے، جسے اکبری دور میں ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق سے امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز نے جرات ایمانی اور جلال فاروقی سے کام لیتے ہوئے ایسی کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے بجا کہا ہے:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نمبران
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت امام ربانی نے پرچم اسلام بلند کرنے کے لئے جو کوششیں کیں ان کی کامیابی اور نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ لکھتے ہیں:

"حضرت مجدد نے اسلام کے لئے اپنا تن، من، دھن سب کچھ لٹا دیا۔ عزیمت پسندی کی ایسی شاندار مثالیں قائم کیں جن سے مردہ دل زندہ ہو گئے اور ایک عظیم انقلاب آگیا۔۔۔۔۔۔ بادشاہ کے حضور سجدہ تعظیمی (زمین بوس) موقوف کر دیا گیا، گائے کی قربانی عام ہو گئی اور سب سے پہلے خود جہانگیر نے قلعہ کاغڑا میں حضرت مجدد کی موجودگی میں گائے زبح کرائی، شراب پر پابندی لگا دی گئی اور بے شمار

اصلاحات ہوئیں۔ بلاشبہ حضرت مجدد کی انتھک جدوجہد سے مذہبی سطح پر اسلام، سنیت اور حنفیت کو فروغ ہوا۔۔۔۔۔۔ سیاسی سطح پر اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہوا۔۔۔۔۔۔ روحانی سطح پر تصور وحدۃ الوجود کی لفظی تعبیرات سے جو ہلاکت پھیل رہی تھی تصور وحدۃ الشہود نے اس کا موثر دفاع کیا اور ناقابل فہم کو عام لوگوں کے لئے قابل فہم بنا دیا گیا۔ اس طرح ہر سطح پر فکر مسلم کی اصلاح کر کے ایک عظیم انقلاب برپا کیا گیا" (۶)۔

مشہور مورخ اور محقق، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

"جہانگیر کے دور حکومت میں شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی آئے، آپ کی مسلسل کوششوں سے تحریک احیائے دین کا آغاز ہوا، چنانچہ اس انقلاب و تبدیلی کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جو کوششیں کی گئیں وہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درباروں کی بدلتی فضا میں مطالعہ کی جاسکتی ہیں، اکبر بادشاہ آزاد خیالی اور الحاد کا نقطۂ عروج تھا، جہانگیر کی تخت نشینی سے اس آزاد خیالی کا زوال شروع ہوتا ہے، شاہجہاں اگرچہ پارسا سنی مسلمان تھا اور دربار میں کسی قسم کی مذہبی ڈھیل برداشت نہیں کرتا تھا، تاہم اس نے غیر سنیوں کو بھی مطمئن رکھا، اورنگ زیب عالمگیر سنیوں کا نشان نصرت تھا" (۷)۔

اکبری دور کے بعد بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں پھر اس فتنے نے سر اٹھایا، ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا گیا، کانگریسی علماء اس تحریک کے ہمراہ تھے، امام احمد رضا بریلوی نے علالت کے باوجود "المحجۃ المومنینہ" لکھ کر ہندو مسلم اتحاد کے تار و پود بکھیر دیئے اور قرآن و حدیث کے دلائل قاہرہ کی روشنی میں دو قوی نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔

کس درد مندی کے ساتھ فرماتے ہیں:

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری، پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خود داری؟۔۔۔

یہ مقالہ ۲۸ صفر ۱۵ جولائی ۱۳۱۷ھ / ۱۹۹۶ء کو روانہ منظر علم کی طرف سے منعقد
امام ربانی کانفرنس، الحمراء ہال میں پڑھا گیا۔

حوالہ جات

- (۱) محمد مسعود احمد پروفیسر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی (مکتبہ نبویہ، لاہور) ص ۱۳ - ۱۳
- (۲) محمد مسعود احمد پروفیسر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی ص ۱۵
- (۳) محمد بن عبد اللہ الحسیب ولی الدین۔ مشکوٰۃ شریف عربی (طبع کراچی) ص ۳
- (۴) احمد سرہندی، امام ربانی شیخ۔ مکتوبات امام ربانی، فارسی دفتر اول مکتوب ۶۵ ص ۵۳
- (۵) احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، شیخ۔ مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب ۲۱۳ ص ۵۲ - ۵۱
- (۶) محمد مسعود احمد، ڈاکٹر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی ص ۲۳ - ۲۳
- (۷) ایضاً ص ۲۹ - ۲۸
- (۸) احمد رضا بریلوی، امام۔ الحجۃ المومنین (طبع بریلی) ص ۸۳
- (۹) عبد الواحد میمنی، سید۔ مقالات اقبال (آئینہ ادب، لاہور) ص ۲۷۸

ماخوذ از مقالات اقبال

مترتبہ سید عبدالواحد ص ۲۹۲

جغرافیائی حدود اور مسلمان

میں نے اپنے مصرع

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ "ملت" قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن حال کی عربی نادرسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سنات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے لیکن چونکہ لفظ ملت کے معنی زیر بحث مسائل پر چیلن ہوئے نہیں۔ اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔

فرنگی نظریہ وطنیت

مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی

گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل
 اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں
 ایسے مشورہ سے قومیت کا جدید رنگ نظر یہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک ہم
 دینی پہلو ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے از بس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ
 میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ
 مقصود ہے۔ حاشا دکلا میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب
 کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپی
 مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی
 ملکائے اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے
 کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کا
 اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تہذیب جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور
 اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے
 حامی نظر آتے ہیں۔ زمانہ کا آلٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغربہ
 پڑھے لکھے مسلمان تفرنگی میں گرفتار تھے، اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید
 یورپ کے جدید نظریے ان کے لئے جاذب نظر ہیں۔ مگر افسوس ہے۔

نور محمد کعبہ رخت حیات گرز آفرنگ آید شلالت و نالت

سیاسی طریقہ میں وطن کا مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں

اقوام اعراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام
 کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم
 سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے
 علیٰ ہذا القیاس حبشی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا
 ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں
 ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ میں اور کل کچھ۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج
 برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان نظریہ خود پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے
 اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ
 اس کی تائید کرتے ہیں۔ حسب الوطنی مونس الایمان کے مفسر حدیث سمجھ کر پیش
 کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری
 جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی
 طریقہ میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے حیثیت اجتماعیہ
 انسانیت کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہمیشہ
 اجتماعی انسانیت کا ایک قانون ہے، اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور
 کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اسلام اور حیثیت اجتماعیہ انسانیت

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام
 حیثیت اجتماعیہ انسانیت کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے

کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو یا معقول و مردود ہے۔ اس کلیہ سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے، یا ہندوستان کی مختلف قومیں یا قبیلے ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں وغیرہ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے قول کے دینی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔

اسلام و اس جماعتی نظام ہے

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی و لائق کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی حیثیتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کو روئے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدبیر بھی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاہم تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدعت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں

کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین تو عمومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و متعلم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جاسکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسان کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک مدت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے۔

ہم دلی از ہم زبان بی بہت راست

مسلمانوں کو بروقت تنبیہ

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی ہوگی اور شرف انسانی کے خلاف ہوگی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اس انتخاب کا؟ مومقر کی اصلاح غیر سلیم عقلیت کا دورہ اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قومیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف بے گیس لادینی، و ہریت، اور اقتصادی جنگوں کی طرف۔ کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اسی تجربہ کا اعادہ ہو؟ مولوی صاحب زمانہ حال

میں قوم کے لئے وطن کی اساس ضروری سمجھتے ہیں۔ بیشک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں بلکہ بہت سی اور قومیں بھی ہیں جو اس قسم کی تفکیر کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً دین کی طرف سے بے پروائی، سیاسی روزمرہ مسائل میں انہماک اور علیٰ ہذا انتظام اور دیگر موثرات جن کو ہم آئینہ پیشہ نہیں سے پیدا کریں تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر ایسی قوم میں مختلف ادیان و مل بھی ہوں تو رفتہ رفتہ وہ تمام ملتیں مرٹ جاتی ہیں اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا، ایک عام آدمی بھی جو دین کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے، نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورت حال پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان سوائس ہے کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریہ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یک جا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اولیٰ تو لادینی ہو گا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

مولانا حسین احمد کا نظریہ وطن

مگر جو فائدہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقت نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے

پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسٹ محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے، انہوں نے لفظ قوم استعمال کیا یا لفظ ملت؟ ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا، جو ان کے تصور میں اسٹ محمدیہ ہے اور اس کی اصل وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور نفوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے غلطی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذر گناہ بدتر اند گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ملت اور قوم کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ ملت کو قوم سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے، جو دین اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں، واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔

دو خطرناک نظریے

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور۔ دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں، اس لئے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیہ میں جذب ہونا چاہئے۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ کا فرق ہے درہ نظریہ وہی ہے جس

کہ اوپر ذکر ہوا اور جس کے اعتبار کیلئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنے والے دن یہاں کے مسلمانوں کو ملحقین کرتے رہتے ہیں۔

یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم تصور نہ کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔

مولانا کی زمین و آسمان

مولانا نے فرمایا ہے کہ میں نے لفظ ملت اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا۔ میں ملت کو وطنی قوم سے بالآخر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گویا اگر قوم زمین ہے تو ملت بمنزلہ آسمان ہے لیکن معنایاً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی اور اٹھ کر ڈر مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم قومیت کو آسمان بناؤ۔ وہی فطرت زمین بنتا ہے تو بنے دو۔

مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معنی میں فرق معلوم نہیں اور شعر کہنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں قاموس کی درج کردہ معنی نہ کر سکا، مجھے زبان عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سرانگھوں پر لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف رجوع کر

یتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدا سے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی انتشہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب۔

تلفذہ جزو و حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقہیہ شہر قاروں سے لغت اسے حجازی کا

قاموس اور قرآن پاک

لیکن آپ کو کون سی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اتکال کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا؟ آیات قرآن میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے اور کیا جماعت محمدیہ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ امت بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا ان الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معانی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ لواحقین الہدیہ کی پابند ہواؤں ملکی و وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی پابند ہو جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی وہ بہت حد تک درست ہے۔ قوم کے معنی جماعۃ الرجال فی الأصل دون النساء ہے۔ گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں

قوم موسیٰ و قوم عاد کے الفاظ آتے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ عربی میں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ملت کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان۔

اولاً اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معرف جماعت میں جوئی ملک یا رنگ و بستان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام قانون کے ماتحت کوئی اور ہیئت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآن حکیم نے اپنی آیات کو کہیں لفظ قوم سے تعبیر کیا ہے؟ یا صرف لفظ ملت یا امت ہی سے پکارا ہے؟ ثانیاً اس ضمن میں وحی الہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے۔ کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ یا اس کا اتباع کر دیا یہ دعوت صرف ملت کے اتباع اور امت میں شمولیت کی ہے۔

قرآن کریم میں ملت کا مفہوم

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملت یا امت وارد ہوا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّنْ أَسْلَمَ وَجْهًا لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَاتَّبَعْتَنِي مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ نَاتِبِغُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ ملت نام ہے ایک دین کا ایک شرح و منہاج کا۔

قوم چونکہ کوئی شرع و دین نہیں ہے۔ اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب بحث تھی۔ کوئی گروہ ہو، خواہ وہ قبیلہ کا ہو، نسل کا ہو، واکوٹوں کا ہو، تاجروں کا ہو، ایک شہر والوں کا ہو، بخرانہ کی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو، وہ محض گروہ ہے۔ رجال کا یا انسانوں کا، وحی الہی یا نبی کے نقطہ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ قوم فوج، قوم موسیٰ، قوم لوط، لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد، قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسیٰ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی۔ قالہ الصلاہ عن قوم فہ عودہ استمد موسیٰ و فرعون۔

لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ مخاطب تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آئے گئے توحید تسلیم کرتے گئے، وہ اسی پیغمبر کی ملت میں آگئے۔ اس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہوتی ہے۔ الخ تو کتنے قوم لایہ منونہ باللہ۔ ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ

ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام اور مل سے نکل کر ملت
ابراہیمی میں داخل ہو گئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا
بلکہ امت کے لفظ سے۔

بنی نوع آدم کی تقسیم

ان گزارشات سے میرا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن
کریم میں مسلمانوں کے لئے امت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا ہو، تو ارشاد
فرمایئے۔ قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ، نسل، رنگ،
زبان، وطن اور اخلاق نژاد جگہ اور نژاد رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ملت سب جات و
کوتراش کو ایک نیا اور مشترک گروہ بنا سکتی ہے۔ گویا ملت یا امت مجاز ہے اقوام کی
خودان میں جذب نہیں ہو سکتی۔

عہد حاضر کے چند دانشان کے علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین
کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جو قرآن یا نبی امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔
کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں، نسلوں
اور وطنوں کو بلانے طاق رکھا گیا۔ بنی آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موجد و مشرک
اس وقت سے لے کر وہی امتیں دنیا میں ہیں، تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے
محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت اسمعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت
کی ردا اور حصے والوں کو اس ملت کے بانہوں کی وہ دمایاوند آئی، جو اللہ کے کلمہ
کی مبادی رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی۔ واذ یزعم ابراہیم ان اقوام

من البیت واسما عیل طربنا قبل منا انک انت السميع العليم۔ ربتنا
واجعلنا مسلمینک لمن ذرینا امة مسلمة تک۔

الکفرة ملت واحدة

کیا خدا کی بارگاہ سے امت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی
تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا
ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ امت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت
ہے اور وہ الکفر ملت واحدة کی ہے۔

امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام دین تقیم ہے۔ دین تقیم
کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی تقیم
ہے اس گروہ کے امور معاشی و معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے
نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں
میں قوم، دین اسلام سے ہی تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف
اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو یا معقول و مردود ہے۔
ایک اور لطیفہ بھی مسلمانوں کے لئے قابل غور ہے کہ اگر وطنیت کا جذبہ ایسا
ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقرار اور ہم نسلوں اور
ہم قوموں کو آپ سے پرغاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض
ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابو جہل اور ابو لہب کو اپنا بنا کر
رکھا اور ان کی دعوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ

قومیت قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین
تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر انھوں نے آپ اس نکتہ پر غور نہیں
فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دینی قیام، امت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان
کو چھوڑنا، ان کو کسی دوسری قومیت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی جانپنا
بے معنی تھا۔ ابو جہل اور ابولہب امت مسلمہ کو ہی آزادی سے بھرتا پھرتا نہیں دیکھ
سکتے تھے کہ بطور ممانعت ان سے نزاع و پیش آئی۔ محمد فداہ احمی واتی، کی قوم
آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزادی تھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت
بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی متابعت میں آئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب
امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب
ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا ہے۔

کے کو پنجہ زد ملک و نسب
اگر قوم از وطن بڑے محمد
نزداد نکتہ دین عرب را
نزداد سے دعوت دین ابولہب را

مقام محمدی

حضور رسالت آپ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا جہل
یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی محبت پرستی پر قائم رہو مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک
کی بنا پر جو تمہارے تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدت عربیت قائم کی جا
سکتی ہے۔ اگر حضور لغو و باطل راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ

ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ لیکن تہ خرا زمان کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی عظمت
انفاذات پر ہے کہ ایک قومیت اجتماعیہ انسانیت قائم کی جائے جس کی تشکیل اس
قانون الہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر
یوں کہنے کے معنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و لسان کے
اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان
مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس
طرح اس پیکر خالی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر محفل میں ابدیت سے
ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے نصب العین امت اسلامیہ کا۔ اس کی بلند یوں تک پہنچنے تک
معلوم نہیں، حضرت انسان کو کتنی حدیاں ملیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم
کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اورسانی امتیازات
کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان کے تین
ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین کیجئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس
حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل
کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو جس کے سیاسی مضمرات کی وجہ
طرزیوں سے مسخ کرنا مظلم عظیم ہے۔ بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمدردی
پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

مولانا حسین احمد کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدبر احسان سے اس
بات کی تائید میں نفس طلب کی ہے کہ ملت اسلامیہ شرف انسانی اور اخوت بشری پر مبنی
ہے بہت سے مسلمانوں کے لئے تعجب و حیران ہو گا لیکن میرے لئے چنداں تعجب و حیران نہیں

اس لئے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آجائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدرتنا انکار حرکت کرتے ہیں۔ اس خیال کی طرف کہ بنی نوع انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے اور دوسری گمراہی جو وطنیت سے ادیان کی اضافیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کے لئے خاص ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

انسان کا نصب العین

یہ نفسیاتی تجزیہ ہے اس تیرہ بحث انسان کا جو اس روحانی خدام میں گرفتار ہو جائے باقی رہائش کا معاملہ میں سمجھنا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کے لئے نص ہے۔ لفظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامیت میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم نقطۂ اللہ ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا مستحضر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ باہم آویز شوق کا، خونریز یوں کا او خوار جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن اور سلامتی پر مومس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں جو

سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ نشاء الہی شہور کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خور ساختہ تفاوتوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امنۃً مسلمۃً ملے کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہاد علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔

قادیانی افکار کا منبع

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں، افکار خاتمیت کا۔ نظریہ وطنیت کے حامی، بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وقت کی معیوریوں کے سامنے متقیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانون الہی ابدالامانہ متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کمال اکمل ہونے سے انکار ہے بعینہ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کمال ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی افکار خاتمیت الہیات کا ایک سلسلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے جس کی توضیح صرف اسی وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمان اور

بعض ان کے بعض بظاہر متعدد و فرقیوں کے دینی انکار کی تازہ سیخ مرتب کرے گا۔
 اس مضمون کو خافانی کے ان دو شعروں پر ختم کرتا ہوں جن میں
 خاتمہ اس نے اپنے ان معاصر حکم سے اسلام کو مخاطب کیا ہے۔ جو
 حق تعالیٰ اسلام کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں بیان کرنا فضل و کمال کی انتہا سمجھتے تھے۔
 نقوش سے سے معنوی تغیر کے ساتھ یہ شعرا آج کو کے نسمان سیاسی تقدیر پر بھی صادق
 آتے ہیں۔

مرکب دیں کہ زادہ عرب است داغ یونانی بر کفل منہ سید
 مشتے اطفال نور تعظم را لوح ادبار در بغل منہ سید
 مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار
 کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں
 بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طائفہ برین جائے۔ اس لئے
 مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں
 پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو شکست دوسرے باطل کو قائم
 کرنا چر معنی دار ہے؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کھیت نہیں تو ایک بڑی حد تک اسلام کے جو
 لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار کفر ہے وہی رہے یا اس سے بھی
 بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی
 کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لکھنا، کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ
 حرام اور ناپسندیدہ ہے۔

چودھویں صدی ہجری

کے عظیم عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) امام احمد رضا خان بریلوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم شیخ الاسلام والمسلمین حضرت الحاج
شیخ ضیاء الدین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ
پر ایک مستند اور جامع دستاویز

ضیاء الدین

کشیانی

مرتبہ

حافظ محمد ظاہر رضا قادری زید المجتہد

نہایت خوبصورت ڈال وارجلد — صفحات ۶۵۶

رضاء الدین اشاعت لاہور پاکستان